اس کے بعد زبیدہ چپ۔ جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔
ایک وقفہ کے بعد میں نے پوچھا "بس؟"
"ہاں بس۔"
"مگر ایک بات تو بوجان نے صحیح کہی۔ آخر اب ادھر جا جا کر جھانکنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب وہاں کونسا تماشا ہو رہا ہے؟"
"میں کہاں اُدھر جا جا کے جھانکتی ہوں۔ مجھے تو اُدھر جانے کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ مگر پتہ نہیں آج شام کو مجھے ہوا کیا۔ بس ایسا لگا جیسے کوئی مجھے کھینچ کے اِدھر لئے جا رہا ہے۔"
اُسی گھڑی باہر سے تالی کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ بوجان بیچ صحن میں کھڑی کچھ پڑھنے پھونکنے کے ساتھ تالی بجا رہی تھیں۔ باری باری چاروں سمتوں میں منہ کر کے پہلے کچھ پڑھا، پھر پھونک ماری، پھر تالی بجائی۔ پچھواڑے والی دیوار کی طرف رُخ کر کے زیادہ زور سے پھونکا، زیادہ زور سے زیادہ دیر تک تالی بجائی۔

"جاگتے رہو"۔۔۔ دور سے آتی جیل کے پہریدار کی آواز سے مجھے احساس ہوا کہ رات بہت گذر گئی ہے۔ زبیدہ بے خبر سو رہی تھی، ہلکے ہلکے خراٹوں کے ساتھ۔ یوں ہی مجھے خیال آیا کہ وہم زبیدہ کو ہوا تھا اور جاگ میں رہا ہوں۔ اسی آن برابر کمرے سے بوجان کی پریشان آواز سنائی دی "ارے ارے یہ کیا کر رہے ہو؟"
میں لپک کر ان کے کمرے میں گیا۔ دیکھا کہ سوتے سے اُٹھ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ ارے ارے کیا کر رہے ہو؟"

"بوجان کیا بات ہے" میں نے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔

بوجان نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ایک دم سے چپ ہو گئیں۔ مجھے دیکھتی رہیں۔ پھر لیٹ گئیں "کچھ نہیں"

"بوجان"

"نہیں، کچھ نہیں" اور فوراً ہی سو گئیں۔ فوراً ہی خراٹے بھی لینے لگیں۔

واپس اپنے کمرے میں آیا۔ روشنی بجھاتے بجھاتے زبیدہ پر ایک نظر ڈالی۔ اسی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ لیٹ گیا۔ کروٹیں بدلنے لگا۔ یوں ہی خیال آیا کہ اس وقت کیا بجا ہوگا، کتنی رات گذر گئی، کتنی رات باقی ہے۔ مگر پتہ کیسے چلتا۔ اس وقت قریب میں گھڑی بھی نہیں تھی۔ دور کی آوازوں پر کان لگائے کہ ان سے رات کے اوقات کا شاید کچھ اندازہ ہو جائے۔ مگر اس وقت کوئی آواز ہی نہیں تھی، پہریدار کی آواز بھی نہیں۔ بس ایک سناٹا۔ مگر پھر یوں لگا کہ جیسے دور بہت دور بہت سے لوگ غل مچا رہے ہوں۔ جیسے شہر کی ساری خلقت گھروں سے نکل کر باہر گلیوں بازاروں میں اُمنڈ رہی ہو۔ کیا واقعی شہر میں کوئی بلوہ ہو گیا ہے۔ کیا واقعی؟ مگر جب دوبارہ کان دور کی آوازوں پر لگائے تو کوئی آواز نہیں تھی۔ پھر ایک سناٹا اور بس۔ میں دم سادھے پڑا رہا۔ پڑا رہا اسی طور دم سادھے۔ کتنی دیر بعد اچانک کہیں دور سے مرغے کی بانگ سنائی دی۔ یہ بانگ سُن کر کس طرح جان میں جان آئی۔ ایک اطمینان سا ہوا کہ اب تو صبح ہو رہی ہے۔ پھر حیران ہوا کہ اچھا صبح ہونے لگی ہے جیسے یہ خلافِ توقع واقعہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی کہیں قریب کی سڑک پر تانگے کے چلنے کی آواز سنائی دی اور اس آواز میں ملی جلی کسی موٹر کے ہارن کی آواز۔ کہیں بہت دور سے رکشا کے تیز دوڑنے کی آواز پھر تو آوازوں کا ایک ریلا سا آ گیا۔ موٹروں کے ہارن، تیز دوڑتی رکشاؤں کا شور، تانگوں، ریڑھوں کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ۔ واقعی یہ تو صبح ہو رہی ہے اور اچانک

چڑیوں کا ایک میٹھا میٹھا شور اُٹھا۔ شاید ہمارے گھر کے آس پاس کے درختوں میں بسیرا کرنے والی سب چڑیاں ایک دم سے جاگ اُٹھی تھیں۔

اُٹھ کر بستر میں بیٹھ گیا۔ کمرے میں باہر سے بہت ہلکا ہلکا اجالا چھن کر آ رہا تھا زبیدہ پر ایک نظر ڈالی کہ اسی شان سے بے خبر سو رہی تھی۔ اسی طرح ہلکے ہلکے خراٹے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ عجب بات ہے۔ وہم زبیدہ کو ہوا تھا، رات آنکھوں میں میری کٹ گئی۔ جماہی لی اور لیٹ گیا۔ میری آنکھوں میں نیند پھولنے لگی تھی۔

۹

جب میں نے ڈیوڑھی سے قدم نکالا تو شہر بدل چکا تھا۔ میں نے دیکھا اور میں حیران ہوا کہ دہشت نے ڈیرا تو میرے گھر میں کیا تھا، یہ شہر کو کیا ہو گیا۔ شہر کبھی کبھی آناً فاناً بھی بدلتے ہیں، اس رنگ سے کہ کہنے کو کچھ بھی نہیں بدلتا مگر سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اور میں ایک ہی وقت میں دو دفعہ حیران ہوا۔ میں نے ڈیوڑھی سے دھڑکتے دل کے ساتھ قدم باہر رکھا۔ دل کو ایک دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جانے باہر کیا نقشہ ہو۔ شاید سب کچھ تلپٹ ہو چکا ہو۔ میں نے ارد گرد نظر ڈالی اور حیران ہوا کہ سب کچھ اسی طرح تھا۔ زندگی کا کاروبار معمول کے مطابق جاری تھا۔ مایوسی ہوئی کہ یک قلم سارے ہی اندیشے باطل ہو گئے۔ اطمینان ہوا کہ سو بھی اچھا ہوا کہ کچھ نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اور حیران ہوا کہ یہ تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ اور میں حیران ہوا کہ اچھا شہر یوں بھی بدلا کرتے ہیں کہ آن کی آن میں سب کچھ بدل جائے اور یوں کچھ بھی نہ بدلے۔ میں نے ایک بار پھر ارد گرد نظر ڈالی حیرت سے اور دہشت سے۔ یہ تو وہ شہر ہی نہیں ہے جو ہوا کرتا تھا۔

زندگی کا کاروبار معمول کے مطابق چل رہا تھا۔ بسیں، منی بسیں، موٹر، سکوٹر، رکشا، تانگے، ریڑھے، سب سواریاں اپنی اپنی چال چل رہی تھیں۔ سوار اپنی راہ، پیادے اپنی راہ۔ پھر بھی مجھے ایک شک ہوا کہ کہیں چال میں کچھ فرق آ گیا ہے۔ یا شاید فضا میں کچھ ہے۔ شاید ایک تناؤ کتنے چہرے صاف صاف تنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

میں ڈر گیا۔ دل میں کہا کہ شہر غصے میں ہے۔ پتہ نہیں کب اُبل پڑے۔ ڈرے ہوئے دل کے ساتھ میں نے ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا اور آس پاس چلنے والوں کی چال کو۔ میں رنجیدہ ہوا۔ دل میں کہا کہ شہر کرب میں ہے۔ مگر گھڑی نہ گزری تھی کہ میں نے چہروں پر خوف کی ایک لکیر دیکھی۔ میں افسردہ ہو گیا۔ دل میں کہا کہ شہر اصل میں دہل گیا ہے، اپنے آپ کو ظاہر نہیں کر رہا ہے، اندر سے ہل گیا ہے۔

ایک ضمیمہ والا سائیکل تیزی سے دوڑاتا ہوا آیا صدا لگاتا ہوا۔ مجھ سے چار قدم آگے جا کر رک گیا۔ کتنے لوگ تیزی سے بس کی طرف لپکے۔ اس ضمیمہ نے تو شہر کی کایا پلٹ دی تھی اور صبح سویرے نکلنے والے سب اخباروں کو دم کے دم میں بے معنی بنا دیا تھا۔ میں نے بھی بڑھ کر ایک ضمیمہ خرید لیا۔ یہ ضمیمہ میں صبح پڑھ چکا تھا مگر اس وقت روداد میں پڑھا تھا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ صبح کو ذرا آنکھ لگی تھی۔ زبیدہ نے آکر جھنجھوڑا:

"اخلاق اٹھو۔ دیکھو تو سہی یہ ضمیمہ والا کیا چلا رہا ہے؟"

اور میرے اٹھنے کا انتظار کیے بغیر ڈیوڑھی کی طرف لپکی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں ابھی تک نیند بھری تھی۔ زبیدہ ایک ورق لے کر آئی۔ سخت بوکھلائی ہوئی تھی۔

"دیکھو تو سہی۔ یہ کیا لکھا ہے؟"

میں نے زبیدہ سے ضمیمہ لے کر پڑھا۔ آنکھوں سے ساری نیند ایک دم سے غائب ہو گئی۔ زبیدہ اس توقع میں میرے بالکل پاس آن بیٹھی تھی کہ میں کچھ کہوں گا، تبصرہ کروں گا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ کلی کی، دانت مانجھے، غرارے کیے، نہایا دھویا۔ باتھ روم میں آج کچھ زیادہ ہی وقت صرف ہوا۔ نہا دھو کر نکلا تو ناشتہ کی میز پر جا بیٹھا۔ ناشتہ کرتا رہا۔ زبیدہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس وقت کتنا بول رہی تھی۔ مجھے چپ دیکھ کر اسے بھی چپ لگ گئی۔ ہاں جب میں چلنے لگا تو آہستہ سے ایک ہدایت کی:

"دفتر میں کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور دفتر سے سیدھے

گھر آنا۔"

بوجان جو دیر سے تسبیح پڑھنے میں مصروف تھیں اٹھ کر قریب آئیں۔ سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھا، پھونکا:

"جاؤ۔ اللہ کی امان میں دیا۔ گھر جلدی آجانا۔ اور دُلھن ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں خود ہی کسی سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ گھر میں کسی سے کوئی بات نہیں کی تو باہر آکر کیا کرتا۔ اور دفتر میں تو فضا ایسی تھی کہ مجھے اور چُپ لگ گئی۔ دفتر میں اس دن دفتر والی فضا ہی نہیں تھی۔ کسی میز پر فائل کھلا ہوا نہیں تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ چائے چل رہی ہو اور گپ شپ ہو رہی ہو۔ جو بھی تھا اکھڑا اکھڑا سا بیٹھا تھا۔ کسی نے منہ سے سگریٹ لگائی ہوئی ہے اور بس منہ سے دھواں اڑائے جا رہا ہے۔ کوئی بڑے انہماک سے ضمیمہ پر نظریں گاڑے ہوئے۔ کوئی کوئی قریب کی سیٹ والے کے ساتھ سرگوشی میں باتیں کرتا ہوا۔ ایک میز کے قریب انبساط کی ایک لہر پھوٹی۔ کسی نے بلند آواز میں کہا:

"خس کم جہاں پاک"۔

کتنی غصیلی نظریں اس طرف اٹھ گئیں۔ دقفہ۔ کوئی غصیلی آواز میں دانت کچکچاتے ہوئے بڑبڑایا: "حرامزادے"۔ خاموشی۔ فضا میں اچانک ایک تناؤ آگیا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ تھوڑا دفتری کام نبٹا دیا جائے مگر اس کشیدہ فضا میں اکھڑ گیا۔ بس فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

"رحمت۔ اگر باس کی طرف سے بلاوا آجائے تو کہہ دینا کہ ان کی طبیعت خراب ہو گئی گھر چلے گئے ہیں۔"

"اچھا صاب۔" پھر قریب آکر آہستہ سے "بہت برا ہوا صاب۔"

"ہاں۔" میں نے بے تعلقی سے کہا اور دفتر سے نکل لیا۔

دفتر سے نکل تو آیا لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جانا چاہیے۔ قدم گھر کی طرف اٹھنے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ بس یوں ہی چلنے لگا۔ اس وقت سڑکوں کا عجب نقشہ تھا۔ لوگ غائب، پرچھائیاں چل رہی تھیں۔ برابر سے کئی رکشائیں گذریں، خالی، اپنی برق رفتاری سے محروم۔ دیر بعد ایک بس گذری مگر اپنی برائے نام سواریوں کے ساتھ کتنی ہلکی ہلکی نظر آ رہی تھی۔ میں کہاں جا رہا ہوں؟ میں نے چلتے چلتے سوچا اور پھر ممتاز کے دفتر کی طرف ہو لیا۔

"آؤ۔" ممتاز نے کتنے بجھے لہجے میں میرا خیر مقدم کیا۔ سگریٹ کی ڈبیا میری طرف خاموشی سے بڑھا دی۔ اسی خاموشی سے میں نے سگریٹ سلگائی اور لمبے لمبے کش لیے۔

"باہر کیا حال ہے؟" دیر بعد اس نے بظاہر ایک سادگی سے پوچھا۔

"حال؟" میں گڑبڑا گیا۔ "یار کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پچھلے دنوں کتنا شور رہا ہے کہ پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ اور آج اتنی خاموشی۔"

"وہ شور جھوٹا تھا۔ یہ خاموشی سچی ہے"۔

"لوگوں کا اس طرح چپ ہو جانا......"

اور میں نے دیکھا کہ ممتاز میری طرف پوری طرح متوجہ ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ سننا چاہتا ہے لیکن میرے لیے تو یہ ایک فقرہ پورا کرنا ہی دو بھر ہو گیا تھا۔

"یار، رات اپنی صحبت اچھی رہی۔ کتنے دنوں بعد ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ دوسرا ذکر نکلا:

"مگر یار تم لوگ جلدی اکھڑ گئے۔ میں تو رتجگے کی سوچ کر آیا تھا۔"

"رتجگا۔" ممتاز تھوڑا افسردہ ہو گیا۔ "ہاں یار۔ اپنے وہ رتجگے تو خواب و خیال ہو گئے۔ مگر خیر اکٹھے ہونے کی ایک تقریب تو پیدا ہوئی۔ بہت لطف آیا۔"

"ہاں۔ لطف تو آیا۔ بلکہ کل بہت دنوں کے بعد مجھے رات خوبصورت نظر آئی۔ اور شہر بھی۔ تمہارے چلے جانے کے بعد بھی میں اور کامریڈ کچھ دیر تک آوارہ پھرتے رہے۔ بھیگتی رات کے اندھیرے اجالے میں شہر اچھا لگ رہا تھا۔ اگرچہ اب اس شہر میں اندھیرا کتنا رہ گیا ہے۔ ان سالی روشنیوں نے رات سے اس کا جادو چھین لیا ہے۔ پھر بھی ..... خیر.... مگر یار جب صبح میں گھر سے نکلا تو شہر بدل چکا تھا۔"

"ہوں۔" ممتاز سوچ میں پڑ گیا۔ "شہر کا اس طرح اچانک بدل جانا....."

میں انتظار کرتا رہا کہ ممتاز آگے کچھ کہے گا۔ مگر وہ چپ ہو گیا تھا۔

"ہاں۔ اس طرح شہر کا اچانک بدل جانا....."

پھر میں بھی چپ ہو گیا۔ گفت گو کے موڑ پر آ کر ہم دونوں پھر الجھ گئے تھے۔

ایک دم سے کامریڈ داخل ہوا۔ گلے سے تھیلا اتار کر میز پر پٹختے ہوئے بولا:

"یار چائے پلواؤ۔"

ظہور بھی کہ تھوڑا پیچھے رہ گیا تھا منہ سے لگے اپنے پائپ کے ساتھ داخل ہوا:

"ظہور تم..... تم کہاں؟"

"یہیں۔ جہاں تم دیکھ رہے ہو۔" ظہور نے اپنی اسی پرانی انٹلکچوئل سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

ممتاز نے بیل دے کر چپراسی کو بلایا:

"صادق۔ چائے لاؤ۔ اور سناؤ باہر کیا حال ہے؟" یہ کہتے کہتے اس نے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس کامریڈ کی طرف کھسکا دی۔

"مت پوچھو۔" کامریڈ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے غصیلے لہجہ میں کہا: "لوگ غصے میں ہیں۔"

"غصے میں؟" میں نے حیرت سے کامریڈ کو دیکھا۔ "مجھے تو لگتا ہے لوگ سہم گئے ہیں۔"

کامریڈ نے غصے سے مجھے دیکھا: "تم سالے سدا کے بورژوا ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر انٹلکچوئل گفتگو کرنے والے۔ تم لوگوں کو کتنا سمجھتے ہو۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ۔" ظہور نے زبان کھولنے کے ساتھ ہی پائپ کو کرید کر سلگانے کا عمل شروع کر دیا۔ اور میں اور ممتاز دونوں کامریڈ کو نظر انداز کر کے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پائپ کا ایک گھونٹ لینے کے بعد گھمبیر لہجہ میں بولا: "آج کی کیفیت دیکھ کر اخلاق کو جو مغالطہ ہوا ہے وہ کل تک دُور ہو جائے گا۔"

"کل تک؟" ممتاز نے تعجب سے ظہور کو دیکھا۔

"ہاں۔ کل تک"۔ اور ایک پیغمبرانہ شان کے ساتھ اعلان کیا: "یہ تاریخی وقت ہے۔ ہم انقلاب کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔"

اتنے میں فاروق آن ٹپکا۔ رواجی علیک سلیک۔ اور فوراً ہی شروع ہو گیا:

"یار عمران خان نے تو کمال کر دیا۔"

کتنی دیر تک بولے چلا گیا اور میچ پر جو ان دنوں جاری تھا بھرپور تبصرہ کر ڈالا۔ پاکستانی ٹیم کی کارکردگی پر وہ کتنا مسرور تھا۔

"کامریڈ، تم کچھ نہیں بول رہے"۔ ممتاز نے کامریڈ کو تھوڑا چھیڑا۔

"آج فاروق کا دن ہے"۔ کامریڈ کے لہجہ میں کتنا غصہ تھا۔

فاروق نے ایک قہقہہ لگایا: "کامریڈ کیا بولے گا۔ یہ اس کا میدان نہیں ہے"۔ اور وہ پھر کرکٹ پر رواں ہو گیا۔

"چلو کامریڈ چلیں"۔ کامریڈ نے ظہور کو ٹھوکا دیا اور کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کو جاتے دیکھ کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم بھی جا رہے ہو؟"

"ہاں یار"۔ فاروق کی بے تکان تقریر سے بور تو میں بھی ہو گیا تھا۔

باہر نکل کر کامریڈ اُبل پڑا: "حرام کا پیسہ آ گیا ہے۔ دونوں سالوں کی آنکھوں پہ چربی چڑھ گئی ہے۔ ضمیر بیچ کھایا ہے"۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا: "کامریڈ، تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟"

"تم بھی تو آئے تھے۔ تم کیا لینے آئے تھے؟"

"میں تو اُلو کا پٹھا ہوں"۔ کامریڈ نے غصے سے کہا۔

"یہ تو کوئی انکشاف نہیں ہے"۔

کامریڈ میرے اس فقرے کو پی گیا۔ پھر اس نے دوسری ہی بات کی: "کوئی بات نہیں ان سب سالوں سے حساب لیا جائے گا۔ کسی سالے کی گردن پہ سر سلامت نہیں رہے گا۔ مستقبل ہمارا ہے"۔

"یعنی مستقبل کے غلام تم ہو"۔

کامریڈ نے مجھے لال پیلی نظروں سے دیکھا: "کامریڈ، کبھی کبھی مجھے تم پہ بھی شبہ ہوتا ہے کہ سالے تم بھی کہیں بک تو نہیں گئے ہو؟"

"یار کامریڈ، تمہیں تو اپنے سوا ہر آدمی بکا ہوا نظر آتا ہے"۔

"ہاں۔ میں صرف اپنے بارے میں جانتا ہوں۔ باقی کسی کے بارے میں اطمینان سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ وہ وقت ہے کہ آدمی اپنے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا"۔

"اپنے سوا"۔ اور اب میں بھی کسی قدر سنجیدگی سے کامریڈ سے مخاطب ہوا: "اپنی ذات کے بارے میں اتنے وثوق سے صرف تم کامریڈ لوگ ہی بات کر سکتے ہو"۔

"اس لیے کہ"۔ ظہور بولا۔ "ہم تم لوگوں کی طرح مریضانہ داخلیت کی الجھنوں میں گرفتار نہیں ہیں"۔

"بالکل ٹھیک"۔ کامریڈ نے پُرزور لہجہ میں تائید کی۔ آج ان دونوں میں کتنا اتحاد نظر آ رہا تھا۔ کامریڈ نے ظہور کے خلاف اپنے سارے شکوک کو دفعتاً معطل کر دیا تھا۔

ظہور نے میری بات کا جواب دیتے دیتے کامریڈ کی طرف رخ کیا: "مگر کامریڈ۔ یہ مت بھولو کہ ایسے حالات میں آدمی کو کبھی کبھی خود پتہ نہیں چلتا کہ وہ بک چکا ہے"۔

کامریڈ ظہور کا منہ تکنے لگا۔ "بھنبھل بھوسا" آہستہ سے کہا اور چپ ہو گیا۔

پھر ہم کتنی دیر تک چپ رہے۔ نہ بیٹھ پا رہے تھے نہ بات کر پا رہے تھے۔ پہلے کتنی کتنی دیر تک بیٹھتے تھے اور باتیں کرتے تھے۔ بس جہاں جس ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے سو بیٹھ گئے۔ گھنٹوں کے حساب سے بیٹھتے تھے۔ اور چل کھڑے ہوئے تو بس چلے جا رہے ہیں۔ نہ پاؤں رکتے تھے نہ زبان رکتی تھی۔ اور اب جب میں اس زمانے کو یاد کرتا تو اس طرح توجیہ کرتا ہوں کہ اس زمانے میں آج کا سا شور اور ہنگامہ نہیں تھا۔ نہ ایسی گنوردل تھی کہ آدمی پہ آدمی گرا پڑتا ہے نہ اتنا ٹریفک ہوتا تھا کہ سواری سے سواری بھڑی نظر آتی ہے۔ مال کتنی خاموش سڑک ہوا کرتی تھی۔ صحیح معنوں میں ٹھنڈی سڑک۔ مگر آج بھی تو مال خاموش تھی۔ پھر ہم سے بات کیوں نہیں ہو پا رہی تھی۔ اور تب مجھے یہ احساس ہوا کہ خاموشی اور خاموشی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس خاموشی نے تو ہمارے دل و دماغ کے سکون سے جنم لیا تھا۔ اور یہ خاموشی، مگر خیر۔ ویسے شہر بھی کبھی کبھی کس طرح اچانک سے بدل جاتے ہیں کہ یوں کچھ بھی نہیں بدلتا مگر سب کچھ بدل جاتا ہے۔

"یار۔ آج تو شام ہی سے اُلو بولنے لگا" ظہور نے چلتے چلتے کہا۔

"ابھی تو اُلو بولے گا"۔ کامریڈ کا غصیلا لہجہ ابھی تک برقرار تھا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ واقعی یہ تو شام ہو گئی ہے۔ شام سے رات۔ جو تھوڑا بہت ٹریفک تھا وہ بھی رفتہ رفتہ معدوم ہو گیا۔ بس کوئی کوئی کار بغیر ہارن دیے، بغیر شور کیے تیزی سے گذری چلی جاتی۔ وقفہ وقفہ کے بعد کوئی سکوٹر، کوئی خالی رکشا۔ فٹ پاتھ پہ چلتا ہوا اِکا دُکا آدمی۔ آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہوتا نظر آنے لگا۔

"مال آج اتنی جلدی خاموش ہو گئی"۔ جیسے میں نے اپنے آپ سے کہا ہو، آہستہ سے

اپنے ہی کان میں۔ اور کامریڈ نے اتنے ہی زور سے اور غصے سے کہا، خبردار کرنے کے لہجہ میں،

"کامریڈ، اس خاموشی سے ڈرو"۔

ہم پہلے ہی اکھڑے ہوئے تھے۔ کامریڈ کی اکھڑی اکھڑی باتوں نے اور اکھاڑ دیا۔

"کامریڈ، میں چلتا ہوں"۔ ظہور نے ایک بیزاری سے اعلان کیا اور ایک دم سے بغیر علیک سلیک کیے اپنی راہ ہو لیا۔

"دقے کے بچے"۔ کامریڈ منہ ہی منہ میں سخت غصے کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔ "یہ سالے انقلاب لائیں گے"۔

"کامریڈ، تمہارا ظہور تو گیا۔ اب کیا ارادے ہیں؟"

"تم بھی جانا چاہتے ہو"۔ کامریڈ نے غصیلی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"پھر کیا کریں یار۔ بوریت ہونے لگی"۔

میرے لہجہ کی بیزاری کو کامریڈ نے محسوس کیا اور فوراً ہی ہاتھ ملا لیا:

"اچھا سلام علیکم"۔

"اور تم؟"

"میرا راستہ تمہارے راستہ سے الگ ہے"۔ اور فوراً ہی وہ مجھ سے منہ موڑ کر دوسری سڑک پر ہو لیا۔

ایک خالی رکشا کتنی دیر سے خالی خاموش سڑک پر بھٹک رہی تھی۔ اشارہ کرنے کی دیر تھی۔ فوراً آن پہنچا۔ میں اس میں بیٹھ گھر کی طرف ہو لیا۔

رکشا والا پورے رستے خاموش رہا۔ مگر جب میں گھر کے دروازے پہ پہنچ کر رکشا سے اترا اور اسے پیسے دینے لگا تو اچانک بولا:

"ایک بات کہوں جی؟"

"کہو۔ کیا بات ہے؟"

قریب آ کر رازدارانہ لہجہ میں بولا: "یہ سب ان لوگوں کا ڈرامہ ہے۔ وہ تو یاں پہ تھا ہی نہیں"۔

"کون یاں پہ نہیں تھا؟" میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

"وہ جی؟"

"کون وہ؟"

"سمجھ جاؤ جی"۔ پھر ذرا قریب آ کر کہنے لگا: "میرے پھوپھا کا بھتیجا کل ہی سعودی عرب سے آیا ہے۔ واں پہ جی اس کی ٹیلر ماسٹر کی دکان ہے۔ شہزادوں کے کپڑے وہی سیتا ہے جی۔ بتا دے تھا کہ میں شہزادے صاحب کے کپڑے لے کر محل میں گیا تو کیا دیکھوں ہوں کہ وہ وہاں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہے۔ میں حیران ہوا کہ اچھا یہ یاں پہ ہے"۔ رکا پھر سرگوشی میں بولا: "کسی کو بتائیو مت"۔

پھر تیزی سے رکشہ سٹارٹ کی۔ یہ جا وہ جا۔

سوتے سوتے آنکھ کھل گئی۔ بس آپ ہی آپ۔ اور ایسے جیسے پوری نیند لے چکا ہوں۔ گھڑی دیکھی۔ لو ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔ مگر مجھے جتنا سونا تھا سو چکا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ بیچ رات میں آنکھ کھل جاتی ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ پوری نیند لے چکے۔ پھر میں پلنگ سے بندھا بستر سے چپکا نہیں رہ سکتا۔ اٹھ کھڑا ہوتا ہوں کہ کچھ کرنا چاہیے۔ تو میں تھوڑی دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا کمرے کی چٹخنی کھول آہستہ سے باہر نکل گیا۔ پچھواڑے کی دیوار پہ ٹمٹماتا چراغ اب بجھنے کو تھا۔ بس آخری دموں پہ تھا مگر میں یہ خیال کر کے حیران ہوا کہ ابھی تک نہیں بجھا ہے۔

زبیدہ کو اوّل رات ہی میں یہ ڈر پڑا تھا کہ بس اب بجھا اور اب بجھا۔ تین دن سے یہی ہو رہا تھا۔ جس شام زبیدہ ڈری تھی اس کے دوسرے ہی دن جب میں نے شام پڑے گھر میں قدم رکھا تو دیکھا کہ پچھواڑے والی دیوار پر ایک دیا ٹمٹما رہا ہے۔

"بوجان، انہوں نے تو کہا تھا کہ چراغ بجھنا نہیں چاہیے۔ یہ تو بجھا جا رہا ہے"۔

بوجان نے چراغ کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر جیسے زبیدہ کی ڈھارس بندھا رہی ہوں، بولیں:

"نہیں دلمن۔ اللہ چاہے تو نہیں بجھے گا۔ لگے گا یہی کہ بجھنے لگا ہے۔ آخر شیاطین سے مقابلہ ہے کوئی کھیل تو نہیں ہے"۔

میں نے چکرا کر پوچھا: "یہ کیا سلسلہ ہے"۔

"بیٹے، آج مولوی غلام رسول آئے تھے"۔

"مولوی غلام رسول..... کس سلسلہ میں؟"

"دلہن کو وہم ہو گیا تھا تو میں نے سوچا کہ انہیں بلا کے کچھ پڑھوا پھونکوا لیا جائے۔ انہوں نے پڑھ پھونک دیا ہے اور سات دن چراغ جلانے کو کہا ہے۔ ہدایت کی ہے کہ بجھنا نہیں چاہیے"۔

"اور اگر بجھ گیا تو؟"

"میرے لال بدشگنی کا کلمہ منہ سے نہیں نکالنا چاہیے۔ اللہ چاہے تو نہیں بجھے گا"۔

چراغ تب سے اب تک ہوا سے لڑ رہا تھا۔ اور لڑتا۔ مگر شاید تیل ختم ہو گیا تھا کہ لو اتنی دھیمی ہو گئی تھی۔ چراغ سے گذر کر میری نظر جیل کی برجی پر گئی جہاں پہریدار ایک ہاتھ میں لالٹین، ایک ہاتھ میں لٹھ لیے ساکت کھڑا تھا۔ مجھے یہ شناخت کرنے میں کہ کوئی کھڑا ہے دیر لگی۔ وہ تو لاٹھی پٹخ رہا تھا اور لالٹین ہلا رہا تھا۔ ساتھ میں اونچی پکار "جاگتے رہو" مگر اس وقت وہ بت کی مثال کھڑا تھا۔ میں نے بہت غور سے دیکھا تب اندازہ ہوا کہ کوئی

کھڑا ہے۔ وہی لمبا تڑنگا آدمی اپنی داڑھی اور لالٹین کے ساتھ۔ آج اس کے اس طرح ساکت و صامت کھڑے رہنے نے مجھے ڈرا دیا۔ فوراً ہی اس طرف سے نظریں ہٹالیں۔ ایسا لگا کہ وہ بہت قریب کھڑا ہے بالکل ہماری دیوار کے برابر اور میری نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے ایسے بن گیا جیسے میں نے اسے دیکھا ہی نہیں ہے اور جیسے مجھے پتہ ہی نہیں ہے کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ مگر اب میں وہاں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ واپس اپنے کمرے کی طرف۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بوجان کے کمرے میں جھانکا۔ بے سدھ سو رہی تھیں۔ ایسی بے سدھ کہ خراٹے بھی نہیں لے رہی تھیں۔ یہ بھی عجیب ہی بات ہے کہ بوجان سو رہی ہوں اور خراٹے نہ لیں۔

کمرے میں آکر پھر بستر پر دراز ہو گیا۔ زبیدہ اسی طرح بے خبر سو رہی تھی۔ ادھر آنکھوں میں دور دور تک نیند نہیں تھی۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ اوٹ پٹانگ خیالات یلغار کرتے رہے۔ تصور میں اٹل بے جوڑ شکلیں بنتی رہیں بگڑتی رہیں۔ دن کے دوران دیکھے ہوئے کتنے نقشے باری باری دھیان میں آئے اور محو ہو گئے۔ کافی ہاؤس میں بتوں کی مثال گم سم لوگ۔ رکشہ والے کی راز بھری سرگوشی۔ "وہ تو یاں پہ تھا ہی نہیں"۔ وہ کون۔ وہ۔ کامریڈ کا غصے سے تمتماتا چہرہ۔ جلا بھنا فقرہ جیسے خبردار کر رہا ہو۔ اس سناٹے سے ڈرو۔ اُس وقت تو نہیں مگر اس وقت پلنگ پر لیٹے لیٹے رات کے اس سناٹے میں ڈر لگنے لگا۔ تعجب لگا کہ یہ کیسی رات ہے کہ سرے سے کوئی آواز ہی نہیں ہے۔ سناٹی راتوں میں بھی بیچ بیچ میں کوئی آواز تو گونجتی ہے۔ بے شک بے تکی بے محل ہی ہو۔ سوتے سوتے اچانک کسی کا بنکارا اٹھنا۔ کسی پرندے کا دفعتاً چلا کر چپ ہو جانا۔ درست کہ ایسی بے تکی بے محل آوازوں سے سناٹے کا احساس اور گہرا ہو جاتا ہے۔ بہرحال وہ آواز تو ہوتی ہے۔ لیکن اس رات جب سے میری آنکھ کھلی تھی سرے سے کوئی آواز ہی سنائی نہیں دی تھی۔ جیل کے پہریدار کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ بھی گم سم تھا۔ اتنی سناٹی رات میرے دل میں دہشت اترنے لگی۔ اسی ہنگام الٹے پلٹے

خیالات کے بیچ مجھے پچھلی شام کا دھیان آیا کہ جب میں گلی سے گذر کر گھر میں داخل ہو رہا تھا، تو وہ کون تھا جو میرے پاس سے تیزی سے گزر گیا تھا۔ کون تھا وہ جو میرے برابر سے شام کے جھٹپٹے میں اس تیزی سے گزرا کہ میں اس کی صورت بھی نہ دیکھ سکا۔ اتنی عجلت میں وہ کیوں تھا۔ کیا عجلت اس کی وجہ تھی یا دانستہ اس نے کوشش کی تھی کہ میں اس کی صورت نہ دیکھ سکوں۔ اس قسم کے کتنے شک ایکدم سے میرے اندر پیدا ہو گئے۔ ایک شک کو دفع کیا تو کسی دوسرے شک نے سر اٹھایا۔ دوسرے شک کا قلع قمع کیا تو کوئی تیسرا شک پیدا ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ آخر ہماری گلی ایسی سنسان تو نہیں ہے۔ یہاں لوگ رہتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، آتے جاتے رہتے ہیں۔ آدمی کو سو طرح کے کام ہوتے ہیں، سو کسی کا عجلت میں گذرنا ایسے کونسے اچنبھے کی بات ہے اور شام کے اوقات میں تو آدمی یوں بھی عجلت میں ہوتا ہے۔ جب دونوں وقت مل رہے ہوں تو قدم خواہ مخواہ تیز تیز اٹھتے ہیں۔ مگر اپنے آپ سے میرا کوئی استدلال میرے کام نہ آیا۔ میں نے اپنے شکوں کی جتنی تردید کی اتنی ہی وہ طاقت پکڑتے گئے۔ اور اچانک مجھے ایک اور شک گزرا کہ کہیں وہ میرے دروازے پر دستک دے کر تو نہیں پلٹ رہا تھا۔ میرے دروازے پر؟ مگر کیوں؟ میں ایکدم سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے سٹول پر رکھی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس اٹھائی اور سگریٹ سلگائی۔ حالانکہ اس وقت مجھے سگریٹ کی کوئی طلب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ مگر شک کی رو اسی طرح امنڈی ہوئی تھی۔ میرے دروازے پر؟ مگر کیوں؟

"ابھی تک جاگ رہے ہو؟" زبیدہ تو بے خبر سو رہی تھی۔ جانے کیسے اس کی آنکھ کھل گئی۔

"ہاں۔ نیند نہیں آ رہی۔"

زبیدہ اٹھ کر باتھ روم گئی۔ واپس آئی۔ لیٹی ہی تھی کہ میں نے پوچھ لیا: "آج شام

کوئی آیا تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔ کیا کسی کو آنا تھا؟"

"نہیں تو۔ ویسے ہی پوچھ رہا تھا کہ شاید کوئی مجھے پوچھنے آیا ہو۔"

"نہیں۔ کوئی بھی نہیں آیا۔" اور یہ کہتے کہتے زبیدہ پھر سنانے لگی۔

میں اسی کشمکش و پیچ میں کہ آخر وہ کون شخص تھا، اس وقت جب وہ میرے برابر سے گذرا تھا میں نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ کیا دھیان دیتا۔ دن بھر میں چلتے پھرتے کتنی چھوٹی موٹی باتیں ہوتی ہیں جن پر ہم ذرا دھیان نہیں دیتے۔ کتنے لوگوں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے، کتنوں سے معمولی علیک سلیک ہو کر رہ جاتی ہے، کتنے پاس سے گذر جاتے ہیں اور ان کا ہم ذرا سا بھی نوٹس نہیں لیتے۔ تو اس کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ ذرا جو اس کا نوٹس لیا ہو۔ مگر اب رات کے سناٹے میں وہ میرے دھیان میں آیا اور میرے دل و دماغ پر چھاتا چلا گیا۔ اس کا پاس سے یوں گذر جانا کہ اس کی صورت نظر نہیں آئی، اس وقت کتنی غیر اہم بے وقعت بات لگی تھی اور اب اسی غیر اہم، بے وقعت بات میں کتنے معنی، کتنے سنگین امکانات پوشیدہ نظر آ رہے تھے۔ آخر وہ کیوں اتنی تیزی سے میرے قریب سے گذرا کہ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکا۔ اسے یوں منہ چھپانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ "جاگتے رہو"۔ جیل کے پہریدار کی آواز اچانک بلند ہوئی، اس طرح نہیں کہ دور سے آ رہی ہو، اس طرح جیسے قریب سے آ رہی ہو۔ بس ایسا لگا کہ وہ برجی سے اتر کر تھوڑا ہمارے گھر کے قریب آ گیا ہے، پچھواڑے کی دیوار کے برابر۔ دل میرا دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ مگر پھر فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔ خود کو ٹوکا، ڈر رہے ہو۔ اس کے ساتھ ہی دھیان کہیں سے کہیں چلا گیا۔ میاں جان اپنے والد کے حضور۔ میرے بیٹے، آدمی تین حالتوں میں پہچانا جاتا ہے:

جب وہ سرخوشی کے عالم میں ہو؛

جب وہ خوف کے عالم میں ہو؛
جب وہ نشہ کے عالم میں ہو؛
اور اے میرے بیٹے، نشہ کی تین قسمیں ہیں؛
ام الخبائث کا نشہ؛
طاقت کا نشہ؛
عشق کا نشہ؛

اور جاننا چاہیے کہ اہلِ بصیرت نے نشوں میں سے صرف نشہ عشق کو جائز جانا ہے۔ باقی نشوں کو باطل ٹھہرایا ہے۔ میاں جان کا تذکرہ جو میں نے پچھلے دنوں پڑھتے پڑھتے بیچ میں چھوڑ دیا تھا اس گھڑی مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

سو اے صاحبو، یہ ہے ہمارے خاندان کا احوال۔ اور اب ضرور آپڑا ہے کہ جستہ جستہ اباجانی کے اوراقِ پریشاں سے نقل کروں کہ یوں اجداد کا ذکر بھی بزبانِ اباجانی فقیر کے تذکرے میں شامل ہو کر اس کے لیے باعثِ شرف بن جائے گا اور گذرے زمانوں کا ایک نقشہ بھی جس میں عبرت کے گوناگوں پہلو ہیں، نظروں کے سامنے آجائے گا۔

منقول از تذکرہ حکیم چراغ علی کہ پدرم بود

اس کج مج بیان چراغ علی نے سنا اپنے اباحضور سے، اباحضور نے سنا اپنے اباحضور سے، اور اباحضور کے اباحضور نے سنا اپنے اباحضور سے کہ اس بزرگ نے وہ حالِ تباہ اور وہ ماجرائے جانکاہ اپنی آنکھ سے دیکھا تھا، دیکھ کر منہ اشکوں سے دھویا تھا۔ یوں بیان کیا اس جناب نے کہ ایک دن یہ خبر عام ہوئی، زبان زدِ خواص و عوام ہوئی کہ باغی ایک تخت کا پکڑا گیا ہے، زنجیروں میں جکڑا گیا ہے۔ کل شہر میں اسے پھرایا

جاوے گا، تماشا خلقت کو دکھایا جاوے گا۔ دیکھنے والے ملامت کریں گے، قصے سے اس کے عبرت پکڑیں گے، خیالِ فاسد بغاوت کا اگر کچھ اور سر پھروں سرکشوں کے دماغوں میں پک رہا ہے تو وے اس سے باز آویں گے۔

تو اگلے دن گجر فجر کا بجتے ہی خلقت گھروں سے نکلی۔ کوچہ و بازار میں امنڈی۔ میں بھی فجر کا دوگانہ ادا کر کے مسجد سے نکلا تو گھر جانے کی بجائے طرف چاندنی چوک کے ہو لیا۔ تماشائیوں کا ازدہام تھا۔ مجمعِ خاص و عام تھا۔ آدمی پہ آدمی گرتا تھا۔ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ چشم تماشہ ایک نئے تماشے کی منتظر تھی۔ زالے ایک نظارے کے لیے مضطرب تھی۔ خدا خدا کر کے سواری باغی کی آئی۔ تماشائیوں کی جان میں جان آئی۔ متھنی ایک بد رنگ نظر آئی۔ ہودا غائب۔ ننگی پیٹھ پہ اس کی ایک شخص باحالِ تباہ بیٹھا تھا۔ سر اس کا جھکا تھا۔ دوشالہ ایک میلا دوش پہ اس کے پڑا تھا۔ دیکھنے والوں نے تھڑی تھڑی کی۔ اوازے کسے کہ نظریں کیوں نہیں اٹھاتا ہے۔ صورت اپنی کیوں نہیں دکھاتا ہے۔ ناگاہ ایک فقیر صفوں کو چیرتا، تماشائیوں کو دھکیلتا پاس اس کے پہنچا اور یوں گویا ہوا کہ اے وہ کہ کل تک صاحبِ جاہ و حشم تھا، مالکِ طبل و علم تھا تیری سواری بادِ بہاری اس راہ سے گزرتی تھی تو تو مجھے عطا کیا کرتا تھا، دامن اشرفیوں سے بھر دیا کرتا تھا۔ آج تیرے پاس کیا ہے کہ اس سائل کو عطا کرے۔ یہ سن کر اس شخص نے نظریں اٹھا کر مانگنے والے کو دیکھا اور دوشالہ دوش سے اتار کر اس کی سمت پھینک دیا۔ تب خلقت نے صورت اس کی دیکھی اور سناٹے میں آگئی۔ کتنی زبانوں سے ایک دم نکلا:

"ولیعہد بہادر"۔

اور پھر ایک دم سناٹا۔ دیکھنے والے دنگ، زبانیں گنگ۔ سب حیران کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ عالم بیداری ہے یا خواب کی سحر کاری ہے۔ پھر دیکھتے دیکھتے حیرت کی جگہ غضبناکی نے لے لی۔ مجمع بپھر اٹھا۔ ملک جیون پہ کہ ولیعہد بہادر کو گرفتار کر کے ظلم خان بنا ہوا تھا،

ٹوٹ پڑا۔ شاہی پہریدار حرکت میں آئے۔ تتو تھمبو کر ملک جیون کو بچالے گئے۔

میں حیران و پریشان گھر لوٹا۔ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ گریبان سحر کا جب چاک ہوا اور قصہ رات کا پاک ہوا تب میں اٹھ مسجد کی سمت چلا۔ نماز سے فراغت پاکر مسجد سے نکلا تو دیکھا کہ چھوٹے بڑے جوان بوڑھے خاص و عام شریف و وضیع سب لپک جھپک چلے جاتے ہیں۔ چاندنی چوک کی طرف ڈھلتے ہیں۔ میں بھی اس رو میں بہ لیا۔ اس تجسس میں کہ دیکھیں آج نیرنگیٔ زمانہ کیا رنگ دکھاتی ہے، کونسا گل کھلاتی ہے۔ جہاں خلقت تھا اندر قطار کھڑی تھی اور کسی آنے والے کی راہ دیکھتی تھی وہاں میں بھی جا کھڑا ہوا۔ ابھی زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ دہی نخوست ماری بدرنگ ہتھنی نمودار ہوئی۔ اب رنگ دگر تھا۔ نقشہ دوسرا تھا ایک لاشہ بے سر پشت پر اس کی دھرا تھا۔ لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو سہم گئے۔ دل انکے دہل گئے۔ آج پھر ملک جیون ظلم خاں بنا چل رہا تھا۔ کمال اترا رہا تھا کہ پورا شاہی دستہ اس کی کمک پر تھا۔

دل کہ دہل گئے تھے رفتہ رفتہ گداز ہوئے۔ آنسو آنکھوں سے جاری ہو گئے۔ حق یہ ہے کہ خلقت جہان آباد کی اس دن بہت روئی۔ میں نے ضبط کا دامن تا دیر تھامے رکھا مگر گھر آتے آتے بند ٹوٹ گیا۔ یہ دو آنکھیں میری گنگا جمنا بن گئیں۔ طبیعت کمبخت پھر بھی نہ سنبھلی۔ تب میں پدر گرامی قدر کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوا۔ دونانو ہو مؤدب ایک طرف بیٹھا۔ اس صاحبِ نظر نے چہرے پر میرے نظر کی، تامل کیا۔ پھر یوں گویا ہوئے:

"جانِ پدر! ہم دیکھتے ہیں کہ چہرے پر فرزند کے ملال کی گرد ہے، رنگت زرد ہے۔ آخر وجہ ملال کیا ہے؟"

میں عرض پرداز ہوا کہ: "پدر بزرگوار کل اور آج میں جو دلخراش منظر ان گنہ گار آنکھوں نے دیکھے ہیں اور ایسے دہشت اثر اخبار ان کانوں نے سنے ہیں کہ جگر کٹتا ہے، کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ کیونکر عاجز گوش گذار کرے کہ